Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 35, Sr.No.96, 2014, pp 11 - 34

مجلہ تحقیق
مجلہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۵، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۴ء، شمارہ ۹۶

مکاتیبِ فقیرؒ کا فنی اور موضوعاتی جائزہ

محمد جنید اکرم☆

Abstract:

To publish the letters of great men, and in this way explore the hidden aspects of their lives has been a popular practice since one and a half century. The following article is a critical analysis of the letters of an august Punjabi poet, researcher, historian and writer. It will reveal the new aspects of the personality of Baba e Punjabi , Dr faqir mohammad faqir.

کرہ ءارض پر موجود پانچ دریاؤں کا یہ حسین وجمیل خطہ ''پنجاب'' زمانہء قدیم ہی سے اپنی فصلوں اور موسموں کے لحاظ سے جنت نظیر خطہء ارضی کہلواتا چلا آرہا ہے۔ یہاں کی ثقافت لاجواب زبان میٹھی، بلیغ اور لوگ فراخ دِل ہیں۔ ہمارے یہاں کے علمانے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی زُلف سنوارنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بالخصوص فارسی اور اُردو زبانوں کے ادب کو فنی اور فکری بلندیوں سے مالا مال کرنے میں اہل پنجاب نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اُردو زبان کو تو جس قدر فنی پختگی اور فکری شعور پنجابیوں نے عطا کیا وہ خود اُن کو نصیب نہ ہوا جن کی اُردو مادری زبان تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، ظفر علی خان، علامہ محمد اقبال، فیض احمد فیض اور نجانے کتنے اور نام لیے جاسکتے ہیں۔ اسی لیے تو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال سے ایک مجلس میں اپنی مادری زبان کی بڑھائی بیان کرتے ہوئے بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے جب یہ چومصرہ پڑھا :

☆ ریسرچ اسکالر، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ریسرچ چیئر، شعبہ پنجابی،، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

میری بولی ایہہ جو بولی، سگویں جاچی تولی
ظفر ،آزاد، اقبال، تِناں دے گھر دی ایہو بولی
ٹانویں ٹانویں لفظ پرائے، باہر قلم دی واکوں
جہڑے ساکوں اُردو وَرتے ہَیں وَرتے اُس ساکوں

تو علامہ خوشی سے جھوم اُٹھے اور فرمانے لگے ''تم سچے ہو تمہارے پاس دلیل ہے، تُم پنجابی میں کسی زبان کا لفظ لکھ لو وہ تمہارا ہے'' (۱) فقیر محمد فقیر پنجابی زبان کے عاشق صادق تھے اور اُنہوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ پنجابی زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مگر اِس حقیقت کے باوجود وہ طبعاً اور مزاجاً متعصب نہیں تھے۔ وہ عشق کو پاک اور تعصب کو منفی جذبہ سمجھتے تھے۔

بابائے پنجابی نہایت جدت پسند اور ترقی پسند ذہن کے مالک تھے۔ اُنہوں نے ادب تخلیق کرتے ہوئے جدید دَور کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اُن کے ہاں ''ادب برائے ادب'' کی جھلک نظر آتی ہے مگر کم کم اور ''ادب برائے زندگی'' تو جیسے اُن کا مقصدِ حیات تھا۔ اُنہوں نے پنجابی زبان کے ادب کو نت نئے آفاقی موضوعات سے مالا مال کر دیا۔ دوسری زبانوں کے علما پنجابی کو علاقائی اور محدود خطے میں بولی، پڑھی اور سمجھی جانے والی زبان کہتے تھے بابائے پنجابی نے اپنی علاقائی زبان کو ملی، قومی، بین الاقوامی، آفاقی اور تحریکی زندگی میں روز مرہ کے تمام تر موضوعات کا پہناوا اوڑھا کر آفاقی زبان بنالیا۔

اُنہوں نے ایسا کرنے کے لیے دوسری زبانوں کے اساتذہ اور ماہرین کی تقلید بھی کی مگر اپنی زبان کے لیے مجتہد کا کردار بھی ادا کیا۔ پنجابی شاعری کو اُن کی خیالی پرواز نے نکھار بخشا تو پنجابی نثر کو دوسری زبانوں کے نثری قد کاٹھ کے برابر لانے کے لیے اُن کی قلمی بوقلمونیوں نے معرکتہ الآرا کارنامے سرانجام دیئے۔ احسان دانش نے بابائے پنجابی کے لیے سچ ہی تو کہا تھا۔

تھا تیری فکرِ رسا کے سامنے حُسن بیاں
ناز کرتی تھی تیری ہستی پہ پنجابی زباں

اِس میں کیا شک ہے کہ اپنے فن کا تو اُستاد تھا
مستند تھا سر بسر جو بھی تیرا ارشاد تھا(۲)

اپنی ادبی زندگی کی آپ بیتی بعنوان ''میری آپ بیتی'' میں اپنے پہلے مجموعہء کلام کی تکمیل پر گوجرانوالہ کے ایک بزرگ اُستاد حکیم منشی امام دین کی خدمت میں حاضری کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں:

''مَیں اپنا مجموعہ کلام لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنہوں نے جستہ جستہ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور اپنے بڑے صاحبزادے کو آواز دی، عبدُ اللہ بھائی ذرا دِیا سلائی تو لانا۔ حکیم صاحب نے میرا مجموعہ کلام اُلٹ کر زمین پر رکھا اور اُسے آگ لگا دی۔ ایک کاغذ اپنے بستر سے نکالا اور اس پر صرف میر، نحو میر، فلسفہ کی ابتدائی کتب صغریٰ و کبریٰ اور قواعد العروض از خلیل احمد بصری لکھ کر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمانے لگے لو بیٹا اِن کتابوں کا اہتمام کرو اور میرے جلتے ہوئے مجموعہ کلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمانے لگے اِس مجموعے کا ایک ایک شعر بھول جاؤ۔'' (۳)

گویا اُنہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز انتہائی صبر آزما حالات میں نہایت کٹھن مشقِ سخن کے ساتھ کیا۔ آپ کی زندگی کا ابتدائی دور اندرونی اور بیرونی خلفشار اور حادثات سے بھرا پڑا ہے۔ والد کی وفات کا حادثہء جانکاہ، رومانوی ہجر و وصال کے صدمات اور پھر مُلکی دگرگوں حالات نے فقیر کے قلم کو جلا بخشی اور اُس کا تخلیقی حُسن روز بروز نکھرتا چلا گیا۔

مکاتیبِ فقیر کے فنی محاسن کا جائزہ کے دوران میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ فقیر نے غالب کی طرح شعوری طور پر بنا سنوار کر مکتوب نگاری نہیں کی نہ ہی اُن کے پیشِ نظر ''مکاتیب فقیر'' کی اشاعت کا کوئی منصوبہ یا خواہش تھی۔ جس قدر خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں تمام اِس بات کے شاہد ہیں کہ وہ کسی نہ کسی ضرورت کے تحت اچانک ہی لکھے گئے۔ یہ فقیر کا قلمی حُسن و جمال ہے کہ فوری اور نظریہء ضرورت کے تحت لِکھی گئی ایک تحریر بھی ادب عالیہ کا شاہکار بن کر پنجابی ادبی تاریخ

میں زندہ و پائندہ ہو جائے۔

مکاتیب فقیر میں کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی اُن کی آسان فہم، سادہ اور سلیس زبان ہے جو کہ پوری آب و تاب کے ساتھ ہر خط میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور نشست و برخاست پوری شان و شوکت اور آن بان کے ساتھ اُن کی زبان کے حُسن کو نکھارتے ہیں۔ لفظوں کی معنوی عظمت، سادگی اور فطری اندازِ بیان کے معترف اُن کے ہم عصر بھی رہے ہیں اور آنے والے ادوار کے ذی شعور اور سخن فہم طلبائے علم و ادب بھی ہمیشہ رہیں گے۔ اُردو نثر پڑھتے ہوئے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اِس قدر خوبصورت اُردو زبان لکھنے والا یہ قلمکار ''بابائے پنجابی'' کے عظیم منصب پر براجمان ہے۔ رہی پنجابی زبان تو اُن کی پنجابی نثر پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ قطار در قطار ہاتھ باندھے ہوئے تختِ فقیری کے سامنے اپنی اپنی مناسب جگہ پر لکھے جانے کے لیے منتظر اور بے قرار کھڑے ہیں۔ بلاشبہ اُن کا تخلیق کردہ ادب پنجابی زبان کی ادبی تاریخ میں ''ادبِ عالیہ'' کا مقام رکھتا ہے۔

راقم السطور کو اُن کی ذاتی لائبریری میں عربی زبان کے اُمراؤالقیس کے دیوان کے علاوہ فارسی زبان کے رُومیؒ، سعدیؒ، رودکی، حافظ شیرازی، فردوسی، عمر خیام، مرزا عبدالقادر بیدل، رازی، سنائی اور شیخ فریدالدین عطار جیسے عالمی شہرت یافتہ علماء، اساتذہ اور مفکرین کی کتب دیکھنے کا اتفاق ہوا جو وقتاً فوقتاً اُن کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔ گویا دُنیائے ادب کے اُفق پر چمکنے دمکنے والے تابندہ ستاروں کی کہکشاؤں کی سیر نے اور اپنی زبان میں اپنی خیالی پرواز کی مشقِ سخن نے اُنہیں ایک ماہر فنکار اور ایک عالم فاضل اُستاد کے مقام پر پہنچا دیا تھا۔

مکاتیب میں اُن کی اُردو اور پنجابی نثر نگاری کے فنی محاسن میں سب سے واضح پہلو اُن کے اندازِ ظرافت کا ہے۔ اُن کی طبیعت کا نمایاں پہلو اُن کا خوش طبع ہونا تھا۔ وہ حیوانِ ظریف تھے۔ اُن کی قربت میں رہنے والے کئی ایک بزرگوں نے بتایا کہ جملے کسنا اور جگت لگانا اُن کی مجلس کا خاصا ہوتا تھا۔ وہ جہاں بیٹھتے ساری کی ساری مجلس کشتِ زعفران بن جاتی تھی۔ اُن کی مجلسی زندگی میں اِس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

حفیظ جالندھری شاہنامہ اسلام تخلیق کر رہے تھے۔ دوسرے تیسرے دن پنجابی ادبی اکادمی کے دفتر واقع ۱۲ جی ماڈل ٹاؤن لاہور میں تشریف لاتے اور بابائے پنجابی کو نئے لکھے جانے

والے اشعار سناتے اور داد وصول کرتے۔ دونوں ہم عمر اور گہرے دوست تھے۔ ایک روز اشعار پڑھتے ہوئے قطب الدین ایبک کے زمانے کا ذکر چل رہا تھا تو حفیظ نے جذبات میں آ کر یہ شعر پڑھا۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غازی مرد ہوں میں بھی
پرانے لشکرِ اسلام کا اِک فرد ہوں میں بھی

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ حفیظ خاموش ہو گئے تو بابائے پنجابی فرمانے لگے کہ حضرت ''غازی مرد'' کا مطلب جانتے ہیں آپ؟ اور پھر ہنستے ہوئے بولے اُس زمانے میں گھوڑوں کے ساتھ ساتھ میدان جنگ میں اُونٹ بھی ہوا کرتے تھے لہٰذا آپ اس شعر کو تبدیل کر لیں اور یہاں لکھ دیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عربی اُوٹھ ہوں میں بھی
پرانے لشکرِ اسلام کی اک جوٹھ ہوں میں بھی(۴)

جوش ملیح آبادی سے گہرے مراسم تھے۔ کراچی کے ایک بازار سے دونوں گذر رہے تھے کہ جوش نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں ایک روز یہاں سے گذر رہا تھا کہ یہاں دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک دوسری سے بولی دیکھو کتنا قوی مرد ہے۔ ڈاکٹر فقیر ہنستے ہوئے کہنے لگے بڑی فضول تھی وہ ''اتنے بڑے کوے کو کوی کہہ دیا'' اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔(۵)

مجلسی زندگی کا یہ ظریفانہ انداز اُن کے شعری اور نثری ادب میں بھی گاہ بہ گاہ مسکراہٹوں کے رنگ بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح طنز و مزاح اور جملے کسنے کا یہ انداز اُن کے خطوط میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اپنے ایک عزیز دوست مستری عُمر دین کے نام خط میں رقمطراز ہیں :

''آپ ٹھہرے ہمارے قبلہ، سو خدارا قبلے کی طرح ازلی ابدی خاموشی کو کبھی توڑ بھی دیا کریں اور اپنی خیریت معہ متعلقین کی خیریت کے اطلاع دے دیا کریں، خدا آپ کو سلامت رکھے''(۶)

مستری عمر دین اور میاں احمد دین لوراں بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کے زمانہء لڑکپن

کے دوستوں میں سے تھے۔ اُن کے ساتھ پیار اور محبت کا گہرا رشتہ تھا۔ میاں احمد دین گجرات کے ایک خوبصورت گاؤں لوراں کے رہنے والے تھے۔ بابائے پنجابی سے دوستی عقیدت اور محبت کی حد تک تھی۔ بابائے پنجابی کے پوتے بھائی عبدالباسط، جو عمر بھر اپنے عظیم دادا کے خدمت گذار رہے ہیں وہ روایت کرتے ہیں کہ میاں احمد دین کو بابائے پنجابی کی اولاد میں تمام افراد خانہ باپ کا درجہ دیتے اور ہمیشہ ''چاچا جی'' ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ بھائی عبدالباسط بتاتے ہیں کہ چاچا جی احمد دین تو جیسے ''ابا جی'' (بابائے پنجابی) کے مرید تھے۔ ہر وقت ساتھ ساتھ ہی رہتے یہاں تک کہ جب بابائے پنجابی نے وفات پائی اور حضرت مبارک شاہؒ کے پہلو میں آرام فرما ہوئے تو چاچا جی احمد دین ہر روز رات کو مزار کے اندر بابائے پنجابی کے قدموں ہی میں رات بسر کرتے۔ تا دم آخر یہی طریقہ رہا اور آخر کار وہیں مزار کے احاطے میں وفات پا گئے۔ ۱۹۲۵ء کے قریبی دور میں فقیر مرحوم گوجرانوالہ میں اپنا مطب بند کر کے لاہور آ گئے۔ یہاں رنگ محل کے علاقہ میں ایک گھر کرایہ پر لیا اور ''پاک تعمیرات'' کے نام سے ٹھیکیداری کی ایک کمپنی بنائی اور لاہور شہر کو اپنا عارضی مسکن بنا کر پیشہ ورانہ اور علمی ادبی زندگی کا آغاز کر دیا۔ لاہور میں ہی شب و روز گذرنے لگے۔ ہفتہ دس دِن بعد گوجرانوالہ گھر کا چکر لگا آتے۔ اسی زمانہ میں میاں احمد دین لوراں کے ایک خط جس میں اُنہوں نے لاہور آنے اور ڈاکٹر فقیر کے ساتھ چند دِن گذارنے کی خواہش کا اِظہار کیا، اُس خط کا جواب لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :

> ''لاہور آنے سے پہلے مجھے اِطلاع دے دیں کہ آپ کس گاڑی پر آئیں گے۔ آتی دفعہ ایک چادر اور ایک گرم لوئی ضرور لائیں۔ فرش میرے ہاں موجود ہے، گذارہ ہو جائے گا''۔ (۷)

میاں احمد دین لوراں ہی کے نام ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں :

> ''بروز پیر آپ سے رُخصت ہو کر رات کو گھر پہنچا تو بخار ہو گیا۔ پیر تک یعنی آٹھ یوم رہا، منگل کو اُتر گیا، منگل ہی کو یعنی آج میں لاہور آ گیا ہوں۔ بہت تکلیف دہ بخار تھا (الحمدُ للہ)۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ باجرے کا بخار ہے۔ مَیں کہتا تھا ہو گا۔ بہر حال خوب چڑھا ایسا مزہ پہلے کبھی نہیں آیا۔'' (۸)

خواجہ اقبال فیروز کے بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؒ کے ساتھ گہرے علمی، ادبی، قلمی اور قلبی روابط اور مراسم رہے ہیں۔ اقبال فیروز اورینٹل کالج کے طالب علم اور بعد ازاں شعبہ فارسی میں اُستاد بھی رہے ہیں۔ چند ذاتی مسائل کی وجہ سے اُنہیں یونی ورسٹی کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر واپس لوٹنا پڑا۔ خواجہ اقبال فیروز زمانہء طالب علمی اور کچھ عرصہ بعد میں بھی ''پنجابی ادبی اکادمی'' میں بحیثیت پبلی کیشنز آفیسر کام کرتے رہے ہیں۔ بابائے پنجابی سے محبت کی بنا پر طرفین کے مابین بذریعہ خط کتابت ملاقاتوں کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ اقبال فیروز بابائے پنجابی کو بچوں کی طرح عزیز تھے اور اُنہیں خط لکھتے ہوئے بعض اوقات محبت میں شگوفے چھوڑتے اور چٹکلے سناتے۔ ان خطوط کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ان میں سے شگفتہ مزاجی کے چند نمونے آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۱، اپریل ۱۹۶۵ء کو اقبال فیروز کے نام لکھے ہوئے ایک خط کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

> '' عید دیاں خوشیاں منان لائل پور جان توں میں تہانوں روکیا نہ، ایس خیال تے کہ دن دیہاڑ بڈھیاں نہیں بالاں دیاں خوشیاں لئی ہُندے نیں۔ پر ویکھن والی گل ایہہ وے کہ تُسیں بال او یا بڈھے ؟ میرے خیال وچ تُسیں بڈھے او بال نہیں۔ کیوں جے اک جامعہ کُلیہ دا اُستاد پُختہ کار بابا ای ہوسکدا اے بال نہیں ہوسکدا۔ فیر جامعہ کُلیہ پنجاب ورگے تعلیمی مرکز دا اُستاد تے اِک ستر ے بہترے توں گھٹ کیہ ہووے گا۔''(۹)

۴، جنوری، ۱۹۶۹ء کو ایک خط اقبال فیروز کے نام تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

> ''خداوند تعالیٰ موجودہ خوشی پر اُس خوشی کا دن بھی جلد دکھائے جب آپ زندگی کی بنیادی ذمہ داریوں کو مجلسی طور پر سرانجام دینے کا زبانی اقرار فرمائیں گے اور ہم سب خوش ہوں گے کہ آپ بھی ہماری طرح زندگی کے اس سفر کے لیے روانہ ہو گئے ہیں جس میں ایک دلنواز ساتھی کی ہر فرمائش آپ کے لیے سنگ

میل ہوگی۔ نجانے آپ سامنے آنے والے ہر نئے موڑ پر کس جذبہ کی سرشار رفتار سے گذریں گے، ہم سب بہر حال آپ کو دیکھ دیکھ کر ہنسیں گے اور ہنستے جائیں گے۔ خدا آپ کو صحت اور استقامت کی دولت سے سرفراز فرمائے (آمین)۔'' (۱۰)

۲۶، فروری، ۱۹۶۹ء کو اقبال فیروز کے نام لکھے ایک خط میں اوری اینٹل کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر محمد باقر اور معروف اسکالر مولا بخش خضر تمیمی سے ملاقات کا تذکرہ اِس طرح کر رہے ہیں:

''۲۴، فروری کو حسب اطلاع لاہور گیا تھا۔۔۔۔ میٹنگ کے بہانہ سے طویل عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب اور خضر راہ سے مل بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔'' (۱۱)

۳۰، جنوری ۱۹۷۲ء کے لکھے ایک خط میں محبت بھرے لہجے میں اقبال فیروز صاحب کی سرزنش کر رہے ہیں :

''مجھے اِس امر کا پہلے سے علم تو ہے کہ آپ کی علمی فضیلت کو قلم اور کاغذ سے نہ صرف اختلاف ہے بلکہ طبعی نفرت بھی ہے۔ اِس ضمن میں صرف یہ عرض کروں گا کہ کبھی کبھار میرے لیے دو چار سطور کا وقتی ضیاع برداشت کر کے اپنی خیریت سے مطلع کر دیا کریں، جو ایک کہن سال قلب کے لیے باعث تسکین ہوگا اور آپ کے لیے لائل پور ہی بیت اللہ بن کر حج اکبر کا اہتمام کر دے گا۔'' (۱۲)

۱۴، اکتوبر ۱۹۷۲ء کو گوجرانوالہ سے اقبال فیروز کے نام ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں :

''ڈاکٹر اصغر علی چوہدری نہایت ہی مخلص اور ہمدرد ہیں۔ گذشتہ تقریباً چار ماہ سے وہ بڑے اہتمام کے ساتھ میرے علاج معالجہ میں لگے ہوئے ہیں۔ دِل کے متعلق بھی وہ خاص دوائی استعمال کروا رہے ہیں۔ مگر دِل آخر دِل ہے، اب تو یہ کیفیت ہے کہ بعض اوقات دو تین دفعہ بھی دِن میں اختلاج کے دورہ پر نکل پڑتا ہے۔ اور مَیں ہوں کہ اِس کے ساتھ ساتھ ہو لیتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ

یہ فاعلِ حقیقی کا ایک فعل ہے جس کے لیے اُس کا شکریہ ہی ادا کرنا چاہیے۔
اس لیے ''الحمدُ للہ'' کو وِردِ زبان رکھتا ہوں''۔ (۱۳)

آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے محمد اشرف ۱۹۶۹ء میں وفات پا گئے۔ ۱۴، جولائی ۱۹۷۱ء کو ڈاکٹر سید اختر حسین اختر، ایڈیٹر لہراں، لاہور، کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

'' معلوم ہُندا اے وچارے اشرف دی وفات دے بعد وی کجھ نحوست دیاں گھڑیاں اجے باقی سن، جہناں دی نیت میرے نال متکا لان دی سی۔ پر اوہناں نوں میری ملنگی دے ہٹھ دا علم نہیں سی۔ ڈیڑھ مہینہ پہلاں ایہہ گھڑیاں معیادی بخارنوں نال لے کے، جہنوں ڈاکٹر ٹائیفائیڈ آکھ کے وچارے بیماراں نوں تراہ ڈرالیندے نیں، میرا پتہ پُچھدیاں آپُجیاں، پر میری آوارگی دی وجہ توں اوہ مینوں لبھ نہ سکیاں۔۔۔

تِن واری راہ دے کجھ موڑاں تے اوہناں داٹا کراوی ہویا، پر مَیں اک واری تِن دِن، دو جی وار چار دِن تے تیجی واری تِن دِن وچ ایہہ یقین دوان لئی کامیاب ہو جاندا رہیا کہ میں اوہ فقیر نہیں جہنوں تُسیں لبھدیاں پھردیاں او، گلوں لاہ چھڈدا رہیا۔ پر لگدا اے کہ مشیت چوتھی واری اوہناں نوں پکیاں کر کے گھلیا اے کہ ایہو فقیر ای ساڈی مراد اے، ایہہ پرتیاں تے آکے مینوں گلاواں پان وچ کامیاب ہو گئیاں۔ مَیں سمجھ گیا کہ ایدکیں میری سخت جانی دا امتحان اے۔ خدا دا لکھ لکھ شکر اے کہ مَیں سولاں ستاراں دِناں دے گھول گھلمے وچ اوہناں نوں بھانج پان وچ فیر کامیاب ہو گیا۔ میتھوں اوہناں کنڈ تے لوا لئی پر مَیں وی دموں نکل گیا۔۔۔

اج تیکر اوسے کمزوری نوں گلوں پیا لاہنا، جہڑی بہت ساری گلوں لہہ گئی اے تے تھوڑی جہی اجے باقی اے۔ تُسیں دوجے سجن اوجہناں نال اپنی ایس کشتی دا

ذکر پیا کرنا۔ پہلے ڈاکٹر محمد باقر ہوریں سن جہناں نال بڑی رازداری نال ایہدا ذکر کیتا سی۔ لُکاء دی وجہ ایہہ سی کہ میں ایہنوں اپنی سخت جانی دی لُہائی سمجھدا ساں، خیال ایہہ آؤندا سی کہ جہڑا سُنے گا کیہ آکھے گا پئی ایہہ اوہ ای پہلوان ایں جہڑا ہڑیاں بڑیاں بلاواں نوں دیہاڑی دُونہہ وچ گلوں لاہ چھڈدا رہیا اے؟ ایہنوں کیہ بنیاں؟

تُہانوں وی ایس گل دی پکی جے ایہدا کسے نال بھوگ نہ پایا جے۔ میں ان شآء اللہ دُونہہ چونہہ دناں وچ کسے ویلے آ کے تہانوں ایس گل دا یقین دوا دیاں گا کہ اللہ دے فضل نال کوئی گل نہیں سی۔'' (۱۴)

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھنے کے بعد راقم الحروف کی ایک پنجابی غزل کے مندرجہ ذیل شعر کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے :

جدوں بولی پنجاب دی وچ لکھے، خط شاعراں دے پڑھے جان لگے
مزہ لین گے غالب دے وانگ لوکیں اک دوجے نوں ساڈے سُنا کے خط (۱۵)

۲۸، فروری ۱۹۶۹ء کو لکھا ہوا ڈاکٹر سید اختر حسین اختر کے نام ایک خط جس میں اپنی بیماری سے متعلق اطلاع دیتے ہوئے بابائے پنجابی" کا اندازِ ظریفانہ ملاحظہ فرمائیے :

'' مَیں حضرت ایدکیں ٹیکیاں تے گولیاں دے لمے چکر وچ رہیاں تے اجے تیکر ہاں۔ خدا ایہناں نوں مگروں لائے یا فیر سانوں ای ایہناں دے مگروں'' (۱۶)

بعض لوگ شعر و شاعری میں بابائے پنجابی" کے شاگرد ہونے کے دعوے دار ہیں، جبکہ روایات میں گنتی کے چند نام ملتے ہیں جن کو باباجی نے اپنی شاگردی میں قبول کیا۔ اُنہی میں فیصل آباد کے رہنے والے اسیر سوہلوی سرِ فہرست ہیں۔ وہ بڑے مضبوط لب و لہجہ کے شاعر تھے اور بابائے پنجابی اس مناسبت سے اُنہیں بڑی محبت اور پیار سے ملتے تھے۔ ۴، جنوری ۱۹۷۲ء کو اپنے اسی عزیز شاگرد اسیر سوہلوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

'' سُنا یار اپنا تے اپنے کم دھندے دا ہُن کیہ حال ای ؟ کدھرے ہتھ اڑیا ای

کہ نہیں ؟ فرید دا لکھ کہ اوہدی صحت تے کم کاج کیسے نیں ؟ مینوں سمجھ نہیں آوندی خورے توں نماز دے نال نال ہُن بھنگ تے نہیں پین لگ پیا ؟ اپنے آپ تینوں کدی حال حیلہ لکھن دا چیتا ای نہیں آوندا۔ کدی ورھے چھے ماہیں جے میں ای پُچھ گچھ لاں تے واہ بھلا، توں اجہی ڈڑ وٹنا ایں جے چُپ ای بھلی۔'' (۱۷)

جہاں تک اُن کے مکاتیب کے موضوعات کا تعلق ہے تو خطوط میں ذاتی نوعیت کے معاملات کم کم نظر آتے ہیں۔ ذاتی نوعیت کی گفتگو زیادہ تر احمد دین لوراں، اقبال فیروز اور اسیر سوہلوی کے نام لکھے گئے خطوط میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ بعض مقامات پر حکمت، دانائی، دانشوری اور فلسفیانہ گفتگو کی گئی ہے۔ مگر یہ بات طے ہے کہ اُن کے مکاتیب کے بالعموم موضوعات پنجابی زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی ہدایت اور کام، کام اور صرف کام کرنے پر دوسروں کو اُکسانا ہے۔ پنجابی پیار کی باتیں تحریر کا موضوع نہ ہوتے ہوئے بھی اُن کی نوکِ قلم کی زینت بن جاتیں۔ ہر دوسری بات گھما پھرا کر پنجابی زبان کے فروغ کے لیے کچھ کرتے رہنے پر ختم ہوتی۔ اقبال فیروز ''پنجابی ادبی اکادمی'' کے پبلی کیشنز آفیسر تھے۔ ہمارے ہاں کتابوں کی اشاعت کے بعد بڑا کٹھن مرحلہ اُن کی مارکیٹنگ اور ترسیل کا ہوتا ہے۔ ۱۱، اپریل ۱۹۶۵ء کو اقبال فیروز کے نام لکھے ہوئے اِسی سلسلہ کے ایک خط میں رقم طراز ہیں :

''کل جد ڈاکٹر محمد باقر صاحب نال ایس مسئلے تے گل بات ہوئی کہ پونے دو لکھ دیاں کتاباں بند پیاں نیں ایہناں دے نکاس دی کوئی صورت کریئے تے اوہناں جواب وچ آکھیا : بیبا! کم نال کسے دا تعلق نہیں۔ ہُن ویکھو نا اقبال ہوریں کل مینوں پُچھ کے ٹُر گئے نیں۔ میں آکھیا سی کہ کتاباں لئی اِشتہار دیو، اج تیکر اِشتہار وی نہیں دِتا گیا۔ نہ کوئی ہور آدمی اگے آندا گیا اے جہڑا پھر ٹُر کے ایہہ انتظام کردا۔ اخبار دا کم اوتھے دا اوتھے ای اے۔ کتاباں دی لِسٹ مساں بنی ایں اوہدے تے وی بڑا ای وقت صرف ہو گیا اے۔ ایہہ سارے

کم پبلی کیشنز آفیسر دے سن۔۔۔

چن جتھوں تیکر تہاڈے اگے دا تعلق اے، کجھ چرسٹی لائل پورنوں بُھل جاؤ تے پبلی کیشنز دے کم وچ ایہناں کو اِنٹریسٹ لوو کہ اک تے سیل ڈپو تے دوجے اپنے پریس تے باہر لے پریس دے کم وچ باقاعدگی آ جائے تے کم ویلے سر نبھدے جان۔۔۔عیدوں دوجے دِن فوراً لاہور اپڑ کے لوڑی دے کماں وَل پوری توجہ دیو۔ میری نصیحت تے ایہہ ای جے کم کم تے اوہ وی اج دا اجو، خدا تہاڈی ہر کم وچ مدد فرمان''۔(۱۸)

اُردو اور پنجابی زبانوں کے معروف ادیب، محقق اور نقاد مرحوم شفیع عقیل کے نام ۱۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

'' آپ کی اطلاع کے لیے پنجابی ادبی اکادمی نے ایک کتاب ''پنجابی قصے فارسی زبان میں'' چھاپی ہے۔ یہ اکیڈمی کی پہلی کتاب ہے تیاری پر روانہ کروں گا۔ دوسری کتاب ''دیوانِ غنیمت کنجاہی'' چھپ رہی ہے اور تیسری کتاب '' بُلھے شاہ'' معہ کافیاں، پورا کلام اور ایک میرا تنقیدی اور تاریخی نوٹ تین سو صفحات کے ساتھ چھپ رہی ہے۔ اِن شآءاللہ تیاری پر یہ بھی بھجوائیں گے۔

اکیڈمی کے دفتر کے لیے عجائب گھر لاہور کا ایک ملحقہ کمرہ حاصل کر لیا گیا ہے جس میں اِن شآءاللہ مارچ سے باقاعدہ رسالے اور دیگر طباعت کا کام شروع کر دیا جائے گا۔۔۔

رسالے کے لیے مضمون کی کچھ ادائیگی (معاوضہ) کا بھی اہتمام ہو گیا ہے۔ اپریل کے پرچہ سے ہر اشاعت کا مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔ چنانچہ جلد ہی کوئی مضمون بھجوائیں تاکہ اپریل تک آپ کے سابقہ مضمون اور موجودہ مضمون کی رعائت سے حق نسبت بھی قائم رہے''۔(۱۹)

ایک اور خط میں شفیع عقیل کو لکھتے ہیں :

''تُسیں ایہہ سُن کے خوش ہوو گے کہ ''پنجابی'' نوں اکیڈمی نے براہ راست اپنے ہتھ وچ لے لیا اے تے ایہہ فیصلہ کیتا اے کہ پنجابی دا ہر پرچہ اگوں توں خاص نمبر ہویا کرے گا۔ اپنے ایس فیصلے مطابق اسیں اگلا پرچہ ''لوک گیت نمبر'' کڈھ رہے آں۔ نالے اکیڈمی نے اپنے لکھاری ساتھیاں نوں مناسب معاوضہ دین داوی فیصلہ کیتا اے۔۔۔

مینوں یقین ایں جے تُسیں لوک گیتاں بارے کوئی چوندا چوندا مضمون لکھ کے ایس نمبر دے بنان سجان وچ ضرور میرا ساتھ دیو گے''۔(۲۰)

شفیع عقیل کے نام لکھے ایک اور خط میں رقمطراز ہیں :

''میں کراچیوں آ کے ڈِھلا مٹھا ای رہیا تے خط نہ لکھ سکیا۔ ہُن رب دا فضل اے۔ تہانوں ایہہ سُن کے خوشی ہووے گی کہ تہاڈے ''پنجابی'' نوں اکیڈمی نے اپنی سرپرستی وچ کڈھن دا فیصلہ کیتا اے تے نالے اگوں توں ایہہ وی کہ پرچہ سہ ماہی کڈھیا جائے گا۔ مضموناں دا مناسب معاوضہ دین دی گل وی نکی گئی اے۔ میں زبانی تہانوں پکی کر آیا ساں کہ کوئی چوندا چوندا علمی، تحقیقی یا تنقیدی مضمون چھیتی بھجوانا پر اجے تیکر تُساں کوئی خیال نہیں کیتا۔ مینوں یقین ایں کہ ہُن بغیر آہلک کیتے ایدھر دھیان دیو گے۔ جنی چھیتی ہو سکے کوئی مضمون گھلو''۔ (۲۱)

۳۰، اپریل ۱۹۶۲ء کو شفیع عقیل کے نام لکھے جانے والے ایک خط میں ایک نئی خبر دی جا رہی ہے۔ لکھتے ہیں :

''اج دی ضروری گل سُن لؤ۔ اکیڈمی ''وارث'' دے ناں نال اِک ہفتہ وار جاری کر رہی اے۔

پہلا پرچہ جون دی پہلی نوں نکلے گا۔ پرچے دی ترتیب وچ کلاسیکل ادب یا

پنجابی زبان دا تاریخی، علمی، ادبی، فنی تے سماجی ورثہ ور گے عنوان نیں۔ اُمید اے تُسیں اپنے مزاج دا کوئی مضمون چھیتی بھجوا دیو گے کیوں جے وقت بہت تھوڑا اے۔ اکیڈمی نے لکھاریاں دے کم دا معاوضہ دینا وی منظور کر لیا اے''۔(۲۲)

شفیع عقیل کے نام ہی ایک اور خط میں بھی مضمون جلد بھجوانے کی بات ہو رہی ہے۔ لکھتے ہیں :

'' چن ! مینوں ایدوں پہلاں تیری کوئی چٹھی نہیں ملی۔ اج اک چٹھی ملی اے جہدے وچ تُساں تاریخ دا پُچھیا اے۔ رسالہ نکل تے یکم جولائی نوں رہیا اے پر مضمون مینوں بڑی چھیتی ملنا چاہیدا اے۔ سارا کم تھوڑا جیہا نہیں نا! نال نال کم مکدا جائے تے چنگا ہووے گا۔ اکو واری تے کم نوں نبھانا ذرا اوکھا ہو جاندا اے۔ مہربانی کر کے کوئی بانکا جیہا مضمون لوک گیتاں بارے بھجواؤ''۔(۲۳)

پاکستان میں پنجابی لکھنے والوں کی پہلی صف میں چوہدری محمد حنیف کا نام بھی نمایاں ہے۔ اُنہیں ۸، مارچ ۱۹۵۶ء کو لکھے گئے ایک خط میں بابائے پنجابی رقمطراز ہیں :

'' پنجابی لئی ویلے کویلے قلم ہلاندے رہیا کرو۔ کجھ کرن جوگ سجن جے دھیان نہ دیہن تے ایہہ کم کویں چلے گا ؟ وڈا کم ایہہ وے کہ ایہدے لئی اپنے آل دوالے ایہدے گاہک بناؤ۔ ایس ویلے تیک تہاڈا ''پنجابی'' چوکھے لمے گھاٹے وچ جا رہیا اے۔ تے جے ایہدی صورت انج ای رہی تے نتیجہ سامنے جے''(۲۴)

۱۶، مارچ، ۱۹۵۶ء کو چوہدری محمد حنیف کے نام ایک خط میں رقمطراز ہیں :

'' پنجابی لئی تسیں کجھ کرن دا جہڑا ارادہ ظاہر کیتا اے، میرا خیال اے ایہہ ساڈا ساریاں دا سانجھا فرض اے۔ اسیں جے ایہدے ول دھیان نہ کراں

گے تے ہور کون کرے گا۔ رہی قوم تے اوہ رب دے فضل نال بڑی سنجوڑی تے ''فرض شناس'' اے۔ اوہدے کولوں اپنے آپ کوئی اُمید رکھنی فضول جہی گل اے''۔(۲۵)

خواجہ نور کاشمیری نے بہت چھوٹی عمر ہی سے مہینہ وار پنجابی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ بابا جی مجھے کوئی بزرگ سمجھتے رہے۔ خط کتابت ہی کے ذریعے اُن سے رابطہ تھا، اور میں اُن دنوں کراچی میں مقیم تھا۔ مگر جب اُن سے پہلی دفعہ لاہور میں ملاقات ہوئی تو وہ مجھے ایک نوجوان لڑکا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خواجہ نور کاشمیری کے نام یکم مئی ۱۹۶۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

''اِک نویں خبر سن لوَ، اکیڈمی یکم جون نوں ''وارث'' دے ناں نال اِک ہفتہ وار پنجابی کڈھ رہی اے۔ اپنی من مرضی دا کوئی مضمون بھجواؤ۔ ڈاہڈا گاٹھواں تے جچاواں۔ اوہدی اشاعت دے بعد اکیڈمی مناسب معاوضہ وی پیش کرے گی۔ وقت بہت تھوڑا اے کالھ کر یا جے''۔(۲۶)

پنجابی مہینہ وار لہراں کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر سید اختر حسین اختر بتاتے ہیں کہ اُن دنوں پنجاب یونی ورسٹی فاضل کا امتحان لیتی تھی اور مَیں نے اور چند دوسرے دوستوں نے مل کر پنجابی فاضل کا امتحان دینے کا اِرادہ کر لیا۔ جلد ہی ہمیں معلوم ہوا کہ جو لوگ اُردو، عربی یا فارسی میں فاضل کرتے ہیں اُن کے لیے ایف اے، بی اے کے امتحانات میں صرف انگریزی پاس کرنا لازم ہے جبکہ پنجابی میں فاضل کا امتحان پاس کرنے والوں کو ایف اے اور بی اے کے مکمل امتحانات دینا پڑتے ہیں۔

ہم لوگ پنجابی فاضل کی کتب لینے کی خاطر اُردو بازار کی نکر پر موجود پنجابی کتابوں کی مشہور دُکان ''شیخ بشیر اینڈ سنز'' پر گئے۔ وہاں شیخ بشیر صاحب خود بیٹھے تھے اُن سے بات ہوئی تو وہ فوراً بولے کہ تم یہ بات ڈاکٹر فقیر صاحب سے کیوں نہیں کرتے ؟ ہم نے بتایا ہم تو اُنہیں جانتے ہی نہیں اور نہ ہی اُن سے کوئی تعلق ہے۔ شیخ صاحب فرمانے لگے وہ ہر روز یہاں تشریف لاتے ہیں تم کل اِسی وقت آجانا۔ مَیں اُن سے بات کر چھوڑوں گا۔ اگلے دن ہم وہاں پہنچے، بابا جی سے ملاقات ہوئی۔ فرمانے

لگے کل صبح کچھ اور لڑکوں کو ساتھ لے کر وائس چانسلر کے دفتر کے باہر صبح نو بجے تک پہنچ جانا۔

اگلے دِن صبح وہاں پہنچتے ہوئے ہم طلباء لیٹ ہو گئے اور ہم اِس قدر شرمندہ ہوئے جب یہ دیکھا کہ بابا جی گوجرانوالہ سے خود درخواست لکھ کر ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ درخواست پر ہم سب سے دستخط کروائے اور ہمیں وہیں کھڑا رہنے کا کہہ کر خود وائس چانسلر کے دفتر کے اندر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد باہر تشریف لائے تو فرمانے لگے ''جاؤ بچو جا کر امتحان کی تیاری کرو اور کل پرسوں کسی وقت شام کو شیخ بشیر صاحب کی دُکان سے آ کر اس آرڈر کی کاپی لے جانا''۔ ڈاکٹر اختر حسین اختر بتاتے ہیں کہ ہم تو خوشی سے ناچنے لگے۔ ہمارا اتنا بڑا مسئلہ بابا جی نے منٹوں میں حل کروا دیا تھا۔

۲۸، فروری ۱۹۶۹ء کو ڈاکٹر سید اختر حسین اختر کے نام لکھے اِس خط میں اِسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پنجابی کے مزید فروغ کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں :

> ''پنجابی فاضل دی مبارک ہووے جے، ہن تے مکمل ڈگری ملن دا فیصلہ ہو گیا اے۔ ایس ریڑھی نوں ہن اگے لے چلن دیاں زوروزور تیاریاں کر لوَ۔''(۲۷)

ستمبر ۱۹۵۱ء سے جب مہینہ وار پنجابی جاری ہوا تو بابائے پنجابی نے انگریزی، اُردو اور فارسی زبان میں قلمی معرکے سرانجام دینے والے پنجابی قلمکاروں کی توجہ ماں بولی کی جانب دلائی۔ اُسی سلسلے میں معروف دانش وَر، صحافی اور غالب و اقبال کے شارح مولانا غلام رسول مہر کو بھی پنجابی میں لکھنے کی دعوت دی گئی۔ آپ نے ایک مضمون لکھا اور آئندہ کے لیے نہ لکھ سکنے کا عذر بیان کرتے ہوئے یہ بھی درخواست کی کہ آئندہ مجھے پنجابی لکھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ بابائے پنجابی نے مضمون شکریئے کے ساتھ وصول کرتے ہوئے ایک خط میں چند سطور اس طرح رقمطراز کیں۔

> '' مضمون کے لیے تکلیف فرمانے کا شکریہ اور بار بار نوازش نہ کرنے کا کھلم کھلا انکار۔ حضرت گذارش یہ ہے کہ اگر آپ جیسے ان تھک لکھنے والے اپنے

راستے کے پہلے قدم پر ہی ''کوہ نہ ٹری تے بابا تریہائی'' کے محاورہ کو اپنانے لگے تو آپ کے مبتدیوں کا کیا حال ہوگا ؟ غریب ''پنجابی'' کی خالی جھولی میں صرف ایک مشت خیرات ڈالنے پر ہاتھ کھینچ لینا جودوسخا کی شان کے خلاف ہے۔ ماہنامہ پنجابی ہر ماہ اپنی خالی جھولی آپ کے درِ دولت پر پھیلاتا رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی مادری زبان کے خالی کشکول کو اپنے بھر بھنڈار سے بھر پور کر کے ہی فقیر تک پہنچاتے رہیں گے۔'' (۲۸)

ڈاکٹر رشید انور پنجابی زبان کے معروف شاعر اور ایڈیٹر تھے۔ اُن کا لکھا ایک جنگی ترانہ جسے عالمی شہرت ملی اور بھارتی حکومت نے اِس ترانے کو ریڈیو پاکستان پر بار بار نشر ہونے سے روکنے کے لیے اقوام متحدہ میں جا کر واویلا کیا۔ اُس ترانے کے نہایت مشہور اور زبانِ زدِ عام بول اِس طرح ہیں۔

جنگ کھیڈ نہیں ہُندی زنانیاں دی
مہاراج ! ایہہ کھیڈ تلوار دی اے

آپ نے ''پنجابی زبان'' کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ لاہور سے جاری کیا۔ پہلا شمارہ جنوری ۱۹۷۱ء کو شائع ہوا۔ پہلے شمارے کی اشاعت سے قبل اُنہوں نے بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیرؒ سے درخواست کی کہ وہ پنجابیوں کے نام ایک ''پیغام'' تحریر فرمائیں۔ بابائے پنجابیؒ نے ایک خط پہلے شمارے کے لیے لکھا جس میں پنجابی زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے نہایت فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے۔ یہاں اُس خط میں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتیہیں۔

'' یقینی اُمید اے کہ تسیں ایس ماہنامے نوں اپنے دیس تے قوم دی آن تے آبرو دے ودھان لئی اوہدے لوڑی دے راہ پا کے اوہدی منزل وَل لجان لئی دِن رات اک کر دیو گے۔ ماہنامہ'' پنجابی زبان'' دے جاری ہون دی خوشی میتھوں ودھ کہنوں ہوسکدی اے۔ مَیں ایہدے دھندے نوں اوہدوں لے کے ٹریا ساں جدوں ایہدے وڈے وڈے حمایتی جہناں وچ بڑے بڑے

''خان بہادر''، '' آنریبل'' تے ''سر'' وی روح چھڈ گئے سن۔

اج ایس زبان لئی اپنا راہ سدھا تے صاف اے۔ کسے موڑ تے کوئی روک اٹک نہیں۔ ہن جے رہ گیا اے تے اوہ ایہدے اندر خانے دا کوڑا اے جہدے ہُونجن دی بڑی لوڑ اے۔ تے اوہدے کھل کھلارے نوں ویکھ کے اج وی ایہہ آکھنا پیندا اے۔

جہڑے رنگ مے خانے نوں چھڈیا سی، اوہو رنگ مے خانے دا اج وی اے رِند دو جڑ کے لنگھ سکدے نہیں، بوہا تنگ مے خانے دا اج وی اے

سمجھ نہیں آوندی ایہناں اندرونی لاگاں ڈانٹاں خورے آپس وچ کوئی مربے ونڈنے نیں جہناں دا جھگڑا پیا رہندا اے۔ نکیاں نکیاں گلاں دے گلھن بنا کے آپس وچ کھڑ بدیاں رہن دا کیہ مطلب اے جد وی کوڑے نوں پھول پھال کے ویکھئے تے تھلیوں سوا ککھ کان دے نکلدا کجھ وی نہیں۔ میرے خیال وچ نکیاں نکیاں گلاں دا ویروا وچاری پنجابی زبان لئی وڈے وڈے زیان دا موجب بناں ہور کیہ ہوسکدا اے۔ جہدے توں اسیں پئے ویکھنے آں کہ ساڈے دانشوراں دی دانشوری ایس ویلے تیکر تھلے دے ایس شعر دا سرناواں بن کے رہ گئی ہوئی اے۔

نچنا،	گاونا،	پینا،	کھانا
لڈی	پانی	ڈھول	وجانا

ذرا انصاف نال ویکھو ساڈی قومی زندگی دی منزل دے پچھلے موڑ اپنے دانشوراں کولوں زیہو جہے شاعرانہ گھول گھلوونے چاہندے نیں یا کسے ہور شے دے طالب نیں ؟

اسیں اج جے ہوئیاں بیتیاں نوں بھل بھلا کے وی اج دے کٹھن دور دی سیاسی بھاجڑ تے مخالف، موافق عقیدیاں دی ہتھو پائی ول دھیان کریئے تے ساڈیاں قومی لاڑاں ساتھوں سوجھ مت، سوچ وچار، تے اُدّم آہر دیاں اٹکلاں دیاں

طلب گار نیں۔ مینوں یقین ایں جے ''پنجابی زبان'' ساڈیاں ایہناں قومی تے وقتی لوڑاں تھوڑاں دا آہر پار کردار رہیا تے ویلے دی ٹور نال انج ٹردا ہویا دین دُنیا ولوں سرخرو ہو کے رہوے گا۔ ''پنجابی زبان'' دے صفحیاں نوں پنجابی دانشوراں جے ہمت، آہر، اتفاق، یقین محکم تے تنظیم دے گہنیاں نال سجا بنالیا تے اِن شآء اللہ تعالیٰ دُنیا دی کوئی طاقت ساڈی قومی منزل دا راہ نہیں روک سکے گی تے اسیں اوس ٹکانے تے ضرور اپڑ کے رہاں گے جتھے قائداعظم رحمتہُ اللہ علیہ سانوں اپڑانا چاہندے سن۔ اسیں سارے ایہہ جاننے آں کہ جدا ک دانشور کوئی مقصدی گل کردا اے تے اوہ اپنا مقصد پورا کر کے چھڈدا اے۔۔۔۔۔ مَیں اپنے سمیت سارے ساتھیاں نوں ایہہ آکھاں گا کہ آؤ سارے کٹھے ہو کے ماہنامہ ''پنجابی زبان'' نوں مقصد دیاں گلاں باتاں نال سجا کے صحیح قومی شعور دے اُبھارن دا آسرا سہارا بنا دیئے تے فیر ایہہ ویکھیئے کہ ساڈیاں ساریاں ملکی لوڑاں تھوڑاں کویں دناں وچ پوریاں ہو کے ساڈے دیس دا امن امان تے سکھ وسیبا بن دیاں نیں''۔(۲۹)

بابائے پنجابیؒ کی ذاتی، علمی اور ادبی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ نوجوانی ہی سے انتہائی مصروف زندگی گذارتے رہے ہیں۔ اور پھر تقسیم ہند سے قبل تو اُن کی سیاسی مصروفیات بھی زوروں پر تھیں۔ لہٰذا، ۳ جنوری ۱۹۳۴ء کو میاں احمد دین لوراں کے نام ایک بہت مختصر لکھا ہوا خط ملاحظہ فرمائیں جس میں محسوس ہوتا ہے کہ میاں صاحب ڈاکٹر فقیر کی عدیم الفرصتی اور وقت کم کم دینے پر اُن سے خفا ہوئے ہیں اور فقیر ''دوستی'' کے بارے میں بھی اپنی سوچ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

''علیکم السلام، عرض ہے کہ دوستوں میں طعنہ زنی ناروا اور ناجائز ہوتی ہے۔ خط لمبا لکھنے سے دوستی لمبی نہیں ہوتی۔ خداوند تعالیٰ دِلوں میں خلوص عطا فرمائے۔ مَیں ہر وقت حاضر اور غلام ہوں۔ جب بھی عزیزم کو چاہیں لے آئیں اُن کی

خدمت میرا فرض ہے۔ مَیں دِل وجان سے غلام ہوں اور بس''۔(۳۰)

میاں احمد دین لوراں کے نام لکھے خطوط میں نجی گفتگو سے ہٹ کر فکری اور فلسفیانہ گفتگو زیادہ ملتی ہے اور ان خطوط میں پنجابی زبان کی ترقی یا فروغ کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ایک تو یہ کہ مکتوب الیہ کو لکھے سولہ (۱۶) خطوط دستیاب ہوئے جو سارے ۱۹۳۵ء تک کے دور میں لکھے گئے ہیں۔ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی زبان کے فروغ کی تحریک چلانے کی جو ضرورت قیام پاکستان کے بعد منظر عام پر آئی وہ پہلے نہیں تھی۔ اور پھر میاں احمد دین پنجابی دُنیا کے آدمی نہیں بلکہ بابائے پنجابی کے چھوٹی عُمر کے ذاتی دوستوں میں سے تھے بلکہ بعض بزرگ جن میں بالخصوص بابائے پنجابی کی لاڈلی بیٹی فہمیدہ اکرم، داماد میاں محمد اکرم اور پوتے عبدالباسط باسط قابل ذکر ہیں، اُن سب کے بقول ''چاچا جی احمد دین ابا جی کے واحد دوست تھے جو اُن کے مُرید بھی ہو چکے تھے''۔ اور انہیں بزرگوں سے یہ بھی روایات ملتی ہیں کہ میاں احمد دین بڑی گہری فکر اور شعور والے دانش ور تھے۔ بابائے پنجابی کے ساتھ مختلف موضوعات پر اُن کے خاصے بحث مباحثے ہوا کرتے تھے۔ بعض خطوں میں ہونے والی گفتگو اِس بات کی صحت کو تقویت بخشتی ہے۔ ۲۴ جون ۱۹۳۵ء کو میاں احمد دین لوراں کے نام لکھتے ہیں۔

> '' قبل از سوال بخشش بزرگ تر چیز ہے اور مجھے یہ معلوم ہے کہ فقیر کی صدا سخی کے لیے ایک نغمہ سے کم نہیں ہوتی۔۔۔ آپ نے جو خط لکھا ہے اُس میں یہ گِلہ ہے کہ مُدت سے مَیں نے خط نہیں لکھا۔ پیارے بھائی! سو برس کی مُدت بڑی نہیں ہاں البتہ ''کبھی نہیں'' کی مُدت بہت بڑی ہے۔۔۔ کاش کہ غریب انسان کو اِس دُنیا میں محبت کرنے اور کیے جانے کی آزادی ہو''۔ (۳۱)

واضح رہے کہ میاں احمد لوراں کے نام لکھے ہوئے تمام دستیاب خطوط بابائے پنجابی کے عہدِ نوجوانی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں مکتوب نگار خود پینتیس برس کے نوجوان تھے۔ ایسی عمر میں اِس طرح کی سنجیدہ اور فکری گفتگو اِس حقیقت کی خبر بھی دے رہی ہے کہ مکتوب نگار اپنی زندگی میں مقام فقر کو پا لینے کے لیے اپنے روحانی سفر کا آغاز کر چکے ہیں۔ فقیری کے مقام کو بابائے پنجابی نے کن الفاظ اور خیالات کا جامہ پہنا کر بیان کیا ہے اُسے، ۶، جولائی ۱۹۳۵ء کو میاں احمد دین کے نام

لکھے ہوئے اِس خط میں ملاحظہ فرمایئے :

'' فقیر وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات سے فانی اور خدا کے ساتھ باقی ہو۔ طبائع سے آزاد اور حقیقت الحقائق سے واصل ہو، فقیر وہ ہے جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہو اور اُس کو سوائے خدا کے کوئی دوسرا نہ جانتا ہو۔ فقیر اُس کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ اُس کے حظوظِ نفسانی سے مار ڈالے اور اپنے مشاہدے کے ساتھ باقی رکھے۔ فقیر وہ ہے جو مثلِ زمین کے عاجز ہو اور ہمیشہ قولِ حق کہے۔ جب خاموش ہو تو اُس کا فعل فقر پر دلالت کرے، سخاوت، رضا، صبر، اشارہ، سکوت، غربت، سیاحت، لباس اور فقر کا حامل ہو۔ مسکین ہو اور خدا کو دوست جانے۔ تمام تعلقات چھوڑ کر بے قراری سے رشتہ رکھتا ہو جو مراد سے خالی ہو۔ فقیر اُس کو کہتے ہیں جب نہ پائے تو چُپ رہے اور جب پائے تو اُس سے دوسروں کو ترجیح دے۔ بندِ طبعیت سے آزاد اور حقیقت سے پیوستہ ہو۔ عُلماء کے سامنے زبان کی محافظت کرے، سلاطین کے آگے آنکھ کی اور اولیاء کے سامنے دِل کی۔ ہر مُلک اور ہر شہر میں جائیداد رکھتا ہو۔۔۔۔ ایک جگہ آپ نے تجسسِ وفا کا ذکر کیا ہے، ہاں کرو اور ضرور کرنا مگر اِس کی مزدوری سے بے نیاز رہنا کیونکہ وفا کی مزدوری نا اُمیدی بلکہ موت ہے۔ بلکہ جن سے طلبِ وفا ہو اُن کی اُمیدوں کا آسرا ثابت ہو کر دکھانا۔ رہا دُعا کروں تو یاد رہے کہ جو التجائی نظروں کو نہیں سمجھتا اُس کے سامنے التجائی زبان شرمندگی کے کمترادف ہے۔(۳۲)

مکاتیب غالب کی اشاعت نے ادبی دُنیا کو ایک اور موضوع دے دیا اور دُنیا بھر کے مشاہیر کے وقتاً فوقتاً لکھے ہوئے خطوط منظرِ عام پر آنے لگے۔ کیونکہ خط ایک ذاتی تحریر ہوتی ہے لہٰذا اِن کی اشاعت سے بڑی قد آور شخصیات کی زندگیوں کے وہ پوشیدہ پہلو بھی سامنے آئے جو عام تحقیق میں چھپے رہتے تھے۔ بلا شبہ بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، پنجابی زبان کے سر برآوردہ شاعر، محقق،

نقاد، مؤرخ، صحافی اور سیوک تھے۔ اُن کے مکاتیب کا فنی جائزہ اور موضوعات کو مختلف اقتباسات کی روشنی میں دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اُن کی تحریکی شخصیت میں ظرافت کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ بابائے پنجابی کی فکری اپروچ اور زندگی کے مختلف رویوں کے بارے میں اُن کی نظریاتی سوچ سامنے آئی ہے۔ اُن کے مکاتیب کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ہم اپنے مقالے کا پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ سکالر مرحوم پروفیسر پری شان خٹک کے اِن جملوں پر اِختتام کرتے ہیں :

'' مَیں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کو ایک کثیر الجہتی شخصیت قرار دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ جس کے مطابق ہمارے زعماء جنھوں نے تا ابد ناموری پائی، بیک وقت سائنس دان، ریاضی دان، حکیم، ادیب، فلسفی اور شاعر ہوا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بہت سارے علوم و فنون کو اپنی ذہنی دسترس میں لے آتے ہیں''۔(۳۳)

☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) محمد جنید اکرم، کچی منڈیر پر ایک چراغ، (قادرالکلامی) صفحہ ۲۶۴، بزم فقیر پاکستان، ۱۲۵/بی ۲، ٹاؤن شپ، لاہور، اگست ۲۰۱۱ء

(۲) احسان دانش، گوجرانوالہ کا چاند. ماہنامہ مہر و ماہ، صفحہ ۱۲، دسمبر ۱۹۷۶ء ایڈیٹر ابوالطاہر فدا حسین فدا

(۳) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، میری آپ بیتی ، سپوتنک، جون ۱۹۹۵ء ناشر کلاسیک، دی مال روڈ لاہور

(۴) محمد جنید اکرم، کچی منڈیر پر ایک چراغ، (قادرالکلامی) صفحہ ۲۶۵، بزم فقیر پاکستان، ۱۲۵/بی ۲، ٹاؤن شپ، لاہور، اگست ۲۰۱۱ء

(۵) محمد جنید اکرم، کچی منڈیر پر ایک چراغ، (قادرالکلامی) صفحہ ۲۶۷، بزم فقیر پاکستان، ۱۲۵/بی ۲، ٹاؤن شپ، لاہور، اگست ۲۰۱۱ء

(۶) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام مستری عُمر دین، قلمی مخطوطہ

(۷) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام احمد دین لوراں، قلمی مخطوطہ

(۸) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام احمد دین لوراں، تماہی پنجابی لاہور صفحہ ۳۸۴، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۹) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اقبال فیروز، تماہی پنجابی لاہور صفحہ ۳۸۵، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۰) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اقبال فیروز تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۸۶، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۱) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اقبال فیروز، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۸۸، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۲) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اقبال فیروز، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۲، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۳) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اقبال فیروز، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۲، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۴) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اختر حسین اختر، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۹، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۵) راقم الحروف کی ایک اَن چھپی غزل کا شعر ہے۔

(۱۶) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اختر حسین اختر،، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۹، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۷) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اسیر سوہلوی، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۴۰۱، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۸) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اقبال فیروز، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۸۶، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۱۹) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام شفیع عقیل، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۴، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۰) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام شفیع عقیل، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۴، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۱) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام شفیع عقیل، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۴، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۲) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام شفیع عقیل تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۴، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۳) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام شفیع عقیل، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۵، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۴) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام حنیف چوہدری، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۵، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۵) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام حنیف چوہدری، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۵، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۶) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام نور کاشمیری، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۹۶، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۷) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام اختر حسین اختر، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۴۰۰، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۸) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام غلام رسول مہر، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۴۰۵، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۲۹) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام ڈاکٹر رشید انور، صفحہ ۵، تماہی پنجابی لاہور، جولائی ء تا ستمبر ۱۹۹۸ء

(۳۰) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام احمد دین لوراں، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۸۰، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۳۱) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام احمد دین لوراں، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۸۴، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۳۲) ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، خط بنام احمد دین لوراں، تماہی پنجابی لاہور، صفحہ ۳۸۵، جولائی ۲۰۰۰ء تا مارچ ۲۰۰۱ء

(۳۳) پروفیسر پری شان خٹک، پنجابی اور اُردو کا عظیم قلمکار، سپوتنک، جون ۱۹۹۵ء ناشر کلاسیک، دی مال روڈ لاہور